روحِ تحقیق، جلد ۲، شمارہ ۴، مسلسل شمارہ:۶، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۲۴ء

مستنصر حسین تارڑ کے نام شفیق الرحمن کے خطوط کا خصوصی مطالعہ

A special study of Shafiqur Rahman's letters to Mustansar Hussain Tarar

ڈاکٹر عاصم علی

پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پنجاب، لاہور۔

تہمینہ رفیق

لیکچرار (اردو)، پنجاب کالج آف سائنس (گلبرگ کیمپس)، لاہور۔

Abstract:

Both Shafiqur Rahman and Mustansar Hussain Tarar's name is are reliable reference in Urdu literature. Both contemporary writers worked for Urdu literature. The correspondence between them was very old. Shafiqur Rahman's letters to Mustansir Hussain Tarar reveal the important secret of his literary and private life. This article presents a special review of Shafiqur Rahman's letters. Which reveal the different angles of their life?

Keywords:

خطوط، مستنصر حسین تارڑ، شفیق الرحمن، غیر افسانوی نثر، ادبی خطوط، ذاتی خطوط

اردو میں خطوط نگاری کو اب باقاعدہ صنف ادب کی حیثیت حاصل ہے اور اس کا شمار اردو کے غیر افسانوی نثر میں کیا جاتا ہے۔ خطوط میں موضوع اور اسلوب کی بوقلمونی کی وجہ سے انھیں ذاتی، نجی، عمومی، کاروباری، سرکاری، دفتری اور سمی وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مکتوب نگار کے وہ خطوط جو عزیز و اقارب، دوستوں اور ہم عصر ادیبوں کے نام ہوتے ہیں وہ اس کی حقیقی زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان خطوط کی مدد سے اس شخصیت کے بارے میں مفید معلومات جمع کی جاسکتی ہیں اور یہ خطوط سوانح نگاری مرتب کرنے میں اہم ماخذ ثابت ہوتے ہیں۔ مشاہیر کے خطوط نہ صرف مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان رازہائے زندگی کو عیاں کرتے ہیں بل کہ ان خطوط سے مکتوب نگار کے حالات و ذات، خاندانی عقائد و نظریات اور دیگر شخصی پہلو کے بارے میں اہم معلومات اخذ کی جاسکتی ہیں۔ خطوط کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر سکندر حیات میکن اپنے مضمون "ادبی مکتوب نگاری کی تحقیق: ایک مایوس کن صورت حال" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "خطوط انسانی زندگی کے مخفی گوشوں کو روشن کرتے ہیں۔ خطوط شخصیات کی تفہیم میں بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ خطوط کے ذریعے مکتوب اور مکتوب الیہ کے زاویہ نظر کا پتا چلتا ہے اور پھر یہی خطوط نادر دستاویزات کا پیش خیمہ بنتے ہیں کیوں کہ نجی امور میں کھل کر باتیں ہوتی ہیں اس لیے خطوط شخصیات کی مختلف پرتوں کو متعارف کرواتے ہیں۔ خط دلی جذبات کا وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں مکتوب اور مکتوب الیہ کے رازو نیاز کی باتوں کا عکس روشن نظر آتا ہے۔ اس ذاتی سی تحریر نے اپنے اندر لطافت اور نفاست کو بھی سمویا ہوا ہے۔"(۱)

شفیق الرحمن کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اردو ادب میں رومانوی افسانہ نگاری اور طنز و مزاح کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ انھوں نے افسانے، خاکے، اور سفرنامے لکھے، شاعری کی، تراجم کیے مگر اپنا جداگانہ سحر انگیز اسلوب پر قرار رکھنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ مزاح نگار کثیر الجہتی آزمائشوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے اپنا تخلیقی

وقار مکمل طور پر برقرار رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پیروڈی کرتے ہوئے بھی کوئی ہلکا سا دل آزار جملہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک "شفیق الرحمن: شخصیت اور فن" میں لکھتے ہیں:

> "شفیق الرحمن اردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جو ساٹھ برس تک آسمان ادب پر پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا۔ انھوں نے لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ابھی تازہ تازہ بلند ہوا تھا۔ اور ہمارے بے یمار نئے اور پرانے لکھنے والے اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے، ان حالات میں بھی شفیق الرحمن نے زمانے یا فیشن کی رو میں بہنے کی بجائے اپنی مرضی اور مزاج کے تابع رہ کر لکھا۔ افسانہ اور مزاح شفیق الرحمن کی دو بنیادی محبتیں قرار پاتی ہیں۔ ان محبتوں کو انھوں نے آخر دم تک نبھایا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی خاکہ لکھا یا تبصرہ، سفر نامہ تحریر کیا یا افسانہ، وہ اردو ادب میں کسی پیروڈی کے مرتک ہوئے یا کوئی نظم ان کے شریر قلم سے سرزد ہوئی، افسانوی اسلوب یا مزاح کی شوخی کو کسی مقام پر بھی انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ ان کی اکثر تحریروں میں تو افسانہ، مزاح اور شفیق الرحمن میں تو من شدم، تو من شدی والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ طویل عرصے تک ادب سے منسلک رہنے کے باوجود انھوں نے نہ تو کوئی ادبی فلسفہ پیش کیا، نہ کسی تحریک یا رحجان سے متاثر و متعلق رہے۔ حتیٰ کہ ادبی دریا میں رہتے ہوئے کسی ادبی مگر مچھ سے بیر یا دوستی کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آیا۔ اس کے باوجود ان کی شہرت کا گراف ہمیشہ انتہائی بلندیوں پہ نظر آیا۔۔۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے کوئی معرکہ سر کرنے یا قلعہ فتح کرنے کی بجائے افسردہ دلوں کی کلیاں کھلانے کا کام لیا۔ جس میں وہ نہ صرف آخر دم تک کامیاب دکھائی دیے بلکہ اس بنا پر تفریحی ادب کے سب سے بڑے نمائندہ قرار پائے۔"(۲)

متمدن انسان کے خطوط ہی اس کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ دراصل مکاتیب تاریخ اور سوانح کے بنیادی ماٰخذ ہیں۔ نجی خطوط میں بے تکلف مضامین لکھے جاتے ہیں۔ وہ مکتوب نگار کی شخصیت کا بے لاگ اور بے تکلف اظہار کرتے ہیں۔(۳) مستنصر حسین تارڑ کی اپنے ہم عصر ادیب دوستوں میں بہ طورِ خاص شفیق الرحمن، کرنل محمد خان اور محمد خالد اختر کے ساتھ طویل عرصہ خط و کتابت کا سلسلہ رہا۔ مستنصر کے نام ان ناموں کو انھوں نے "خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر" کے عنوان سے مرتب کر کے ۲۰۱۲ء میں شائع کیے۔ انھیں شفیق الرحمن ایسے نابغہ روزگار ادیب سے مراسم پر ہمیشہ فخر رہا۔ انھوں نے ان خطوط کی اشاعت سے ان کی زندگی کے در وا کیے کیوں کہ ادب میں ان کو جتنی پذیرائی حاصل ہوئی اس کے برعکس ان کی حقیقی زندگی دکھ اور مصائب سے بھرپور تھی۔ شفیق الرحمن کی تمام تر ادبی فتوحات کے باوصف جب ہم ان کی ذاتی زندگی پہ نظر کرتے ہیں تو وہ بھی ہمیں قدم قدم پر کامرانیوں سے بھری دکھائی دیتی ہے۔ تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ان کی زندگی میں دکھوں اور مصائب بھرے تھے ان کے قارئین اس سے بے خبر رہے قارئین کو ان خطوط سے شفیق الرحمن کی دکھ بھری زندگی کے ایام کا بخوبی انداز ہو جاتا ہے۔ شفیق الرحمن نے مستنصر کی ادبی و عائلی زندگی میں دونوں حوالوں سے رہنمائی کی۔ ان دونوں کی دوستی جس کا آغاز بہ طور مداح ہوا تھا جو شفیق الرحمن کی زندگی تک جاری رہا۔ ان کے یہ خطوط ادب کا اہم سرمایہ ہیں جس سے ان کے زندگی کے اہم گوشے منور ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ان خطوط کو مرتب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انھوں نے ان خطوط کو سنبھال

کر رکھا۔ ان خطوط کی تعداد دسیکڑوں میں تھی مگر اپنی سست روی کے باعث وہ ان خطوط کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ ان کو مرتب کرنے کا خیال ان کو کیسے آیا اس کے بارے میں وہ ماڈل ٹاؤن پارک میں رقم سے گفت گو کے دوران بتاتے ہیں:

> "چند برس پہلے ایک ادبی جریدے کے ایڈیٹر نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ ہم محمد خالد اختر پر ایک خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ ہم نے اکثر ان سے آپ کا ذکر سنا تھا تو کیا آپ ہمیں آپ کے نام لکھے گئے خالد اختر کے چند خطوط عنایت کر سکتے ہیں جو کہ اس ادبی جریدے میں شامل کیے جا سکیں۔ میں نے اپنی سٹڈی کے نہاں خانوں میں ایک مدت سے دھول جمع کرتی، بوسیدہ ہو چکی ان فائلوں سے مجھے تلاش تو خالد اختر کو کرنا تھا لیکن وہاں شفیق الرحمن اور کرنل محمد خان کی بھی کچھ تحریریں بھی سانس لیتی تھی۔ تب میں یہ سوچا کہ اس سے پیش تر کہ دیمک ان کی شیدائی ہو جائے کیوں نہ ان نابغہ روزگار لوگوں کی تحریروں کو زمانے کے سپرد کر دوں۔ ان کی ذاتی زندگی پر ایک کھڑکی کھول دوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو گویا ادبی بے ایمانی کا مرتکب ہوں گا۔(۴)"

مستنصر حسین تارڑ سے شفیق الرحمن کا پہلا تعارف بہ طور مصنف "برساتی" ہوا۔ انھوں نے لڑکپن میں جن مشہور ادیبوں کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ان میں سر فہرست شفیق الرحمن کا نام بھی تھا۔ شفیق الرحمن کی تحریروں نے ان کے اندر کے سیاح کو زندہ کیا۔ مستنصر حسین تارڑ اس بارے "تکیہ تارڑ" میں دوران گفت گو بتاتے ہیں:

> "بیڈن روڈ پر بہت سی آنہ لائبریریاں تھیں اور جن کے مالک مجھ سے بے حد ناراض رہتے تھے۔ میں صبح سویرے ایک ضخیم سی کتاب لے جاتا اور شام ہونے سے پہلے ہی پڑھ کر واپس کر دیتا تھا۔ اس حساب سے کتاب کا ایک روز کا کرایہ صرف ایک آنہ بنتا جب کہ اس کتاب کا کرایہ عام طور پر آٹھ دس گنا زیادہ منافع کا سبب بنتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ مجھے دور سے دیکھتے ہی کتاب دینے سے انکار کر دیتے کہ ابھی کوئی نئی کتاب نہیں ہے۔ میں ان کے تمام تر ذخیرے یہاں تک کہ ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی، تیر تھ رام فیروز پوری اور ابن صفی کی کتابیں بھی پڑھ چکا تھا اور ان مصنفین تک بھی رسائی حاصل کر چکا تھا جو میرے ادبی مستقبل پر اثر انداز ہوئے مثلاً بلونت، بیدی، کرشن، منٹو، قاسمی اور شفیق الرحمن۔ اس کے بعد میں انگلستان چلا گیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک سگریٹ فیکٹری میں بڑے بڑے کارٹن اٹھاتے ہوئے جانے ایک روز کیا ہوا کہ شفیق الرحمن کی "برساتی" ایک متحرک فلم کی طرح میرے سامنے حرکت کرنے لگی۔ "برساتی" ایک سفر نامہ ہے جس نے نو عمری کے اوائل میں میرے اندر چھپے ہوئے آوارہ گرد کو تھپکی دی اور میرے بدن میں دیوانگی سیاحت کا پہلا کانٹا چبھویا۔ اس روز میں گھر واپس آیا اور شفیق الرحمن کو ایک مخصوص قسم کا احمقانہ فین لیٹر لکھ دیا۔ اس بات کو چند روز ہی گزرے تھے کہ مجھے ایک ایسا خوش بودار اور زنانہ ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا لفافہ ملا جس میں شفیق الرحمن کا خط تھا۔ "یونان صرف موسم بہار میں جاؤ، پھولوں سے اٹا ہو گا۔ سوئٹزر لینڈ موسم گرما میں خوش گوار ہوتا ہے اور اطالیہ کسی بھی موسم میں چلے جاؤ۔" وہ ان دنوں شاید لیفٹیننٹ کرنل یا میجر تھے۔ اس پہلے خط کو لکھے ہوئے آج کئی دہائیاں گزر چکی ہیں۔(۵)"

قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمن کے درمیان جو ایک تعلق تھا اس کو انھوں نے میمونہ اور سلجوق کی موجودگی میں

سرسری طور پر بیان کیا۔ یہ شفیق الرحمن کی زندگی کا ایک اہم راز تھا جو آج سے پہلے کسی پر نہیں کھلا لیکن مستنصر نے ان خطوط کے ذریعے اپنے قارئین کی نظر کیا۔ قرۃ العین حیدر کی سوانح عمری "کار جہاں دراز" میں شفیق الرحمن کا ذکر تک نہیں۔ لیکن شفیق الرحمن کی یہ رغبت یک طرفہ ہرگز نہ تھی کیوں کہ وہ خود اپنی وجاہت کے گھمنڈ میں تھے اور اگر لندن میں ان کی باہمی رغبت سے کچھ ملاقاتیں ہوئیں تو یقیناً یہ وہی مرد تھا جسے دیکھ کر عینی آپا کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ورنہ وہ اس کے ساتھ یہ میل ملاقات کیوں کرتیں۔ لندن کے کسی بس سٹینڈ پر اپنی ساڑھی کا پلّو درست کرتی، لپ سٹک کا شیڈ ہونٹوں پر گہرا کرتی ان کا انتظار کیوں کرتیں؟(۶)

جیسے حسن وجوانی اور ماں باپ سدا نہیں رہتے اور نہ ہی سدا گوریوں کی بانہوں میں کنگن کھنکتے ہی، ایسے ہی ۶۲۔ویسٹ برجI کے اس گھرے میں سدا بہار نہ رہی، ایک مہیب سیاہ خزاں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔(۷) شفیق الرحمن کی تمام تر ادبی فتوحات کے باوصف جب ہم ان کی ذاتی زندگی پہ نظر کرتے ہیں تو وہ بھی ہمیں قدم قدم پر کامرانیوں سے بھری دکھائی دیتی ہے۔ سرجن ریئر ایڈمرل کے عہدے تک ترقی، دنیا بھر کی سیاحت، اکادمی ادبیات کی پہلی چیئرمین شپ، ستارہ امتیاز، راولپنڈی کے بہترین علاقے میں اپنی ضروریات اور مرضی کے مطابق تیار کیا ہوا اچھا گھر، ایک اچھی اور معروف فیملی میں شادی، پڑی لکھی بیگم، بچوں کی اچھی تعلیم، بہترین ملازمتیں، مثالی حالات۔ ایسے میں ان کے دو جوان بیٹوں کے ساتھ پیش آنے والے خوف ناک سانحات اور تیسرے بیٹے کی ناکام ازدواجی زندگی مکمل طور نا قابل فہم ہے سمجھ میں آتی کہ ایسے قابل رشک حالات کے باوجود بچوں کی تربیت میں ایسی کون سی کمی رہ گئی کس کی نظر کھا گئی، جس نے خوشیوں کے اس گہوارے کو اداسیوں کے مسکن میں تبدیل کر دیا۔(۸) دو جوان بیٹوں نے خودکشی کر لی۔ شفیق الرحمن ان کے غم نڈھال اس دنیا سے رخصت ہوئے اور کی بیگم بھی جلد اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

مستنصر کو ان کے بیٹے کی حادثاتی موت کی اطلاع ملی اور وہ تدفین میں شرکت کی غرض سے گھر سے نکلے لیکن بے چین اور منتشر خیال سے ریلوے سے یہ سوچ کر واپس آ گئے کہ وہ شفیق الرحمن سے کیا کہیں گے؟ جس باپ کا بائیس برس کا شیشم کے درخت کی مانند تناور اور قامت میں آسمان کو چھوتا ہوا کڑیل بیٹا مر جائے اس کے ٹکڑے ہو جائیں تو کیا اس کے باپ سے تعزیت کرتے ہوئے یہ کہنا کہ بہت افسوس ہوا۔ ان کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ جنازے میں شرکت کا حوصلہ نہ کر سکے اور گھر واپس آ گئے۔ مستنصر نے چند روز بعد شفیق الرحمن کو خط لکھا جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"آپ کا پر شفقت خط ملا۔ ممنون ہوں۔ عزیز خلیق الرحمن بیسویں برس میں تھا اور اپنے پہلے سالانہ میڈیکل کالج کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ نہایت سیدھا سادا لڑکا تھا۔ بالکل درویش صفت۔ شاید مضبوط جسم کی وجہ سے اس کا نام JOE پڑ گیا میرے بڑے بھائی جب خطوط میں اس کا ذکر کرتے تو ہمیشہ Saintly Joe لکھتے۔ پچھلے سال سے اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں۔ بالکل Chestnut رنگ کی۔ میڈیکل کالج میں داخل ہونے سے پہلے کراچی اور راولپنڈی میں وہ میرا ورزش کا ساتھی ہوا کرتا۔ ہم لمبی سیروں پر اکٹھے جاتے۔ Stadium میں دوڑ لگاتے اور اسلام آباد کلب کے تالاب میں تیرتے۔ اس کے چلے جانے پر کبھی کبھی وہ سکاٹش دھن یاد آ جاتی ہے جو دوسری جنگ عظیم میں رائل نیو کے Destroyers میں سنی تھی۔ جب جہاز Steam off کرتا تو دوسرے ساکن جہاز کا بینڈ یہ Lines بجاتا۔

will ye no come back again?

will ye no came back again?
better loved you canna be
will ye no come back (9)

مستنصر حسین تارڑ کا شفیق الرحمن سے خط کتابت کا سلسلہ بہت پرانا تھا جب انھوں نے بہ طور مداح انھیں لندن سے پہلا خط لکھا تھا۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ وہ ان خطوط کو سنبھال نہ سکے اور وہ گرد زمانہ میں گم گئے۔ انھوں نے شفیق الرحمن کے کل چھبیس خطوط شامل کیے اور ان کو سنین کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ پہلا خط ۱۴جولائی ۱۹۷۱ء اور آخری خط ۲۳اپریل ۱۹۹۷ء کا ہے۔ شفیق الرحمن اور مستنصر کے درمیان زیادہ تر خط کتابت ادبی اور ذاتی نوعیت کی تھی۔ دونوں کے درمیان رشتہ نہایت ادب و احترام کا تھا۔ شفیق الرحمن کے خطوط بنام مستنصر سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کو کتنا عزیز رکھتے تھے وہ نہ صرف ان کو ادبی حوالے سے بل کہ ذاتی زندگی کے بارے میں بھی مفید مشورہ دیتے۔ ''نکلے تیری تلاش میں'' کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ مستنصر کے ہر شمارے کی کاپی شفیق الرحمن کے مطالعہ کے لیے ارسال کرتے جس پر وہ نہ صرف پسندیدگی کا اظہار کرتے اور اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے۔ جب یہ سفر نامہ کتابی صورت میں شائع ہونے لگا تو انھوں نے اس کے بارے میں مفید مشورے بھی دیئے۔ وہ نہ صرف کتابوں کے حوالے پر بل کہ ٹی وی پر نشر ہونے والے مستنصر کے پروگرام کے حوالے سے بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ ''۱۴جولائی ۱۹۷۱ء'' کو خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا خط مری سے redirect ہو کر ملا، شکریہ۔

مجھے بارہ سال پہلی کی خط کتابت یاد ہے۔ یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ سفر نامہ لکھ رہے ہیں۔ مجھے سفر نامے بہت پسند ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کے چند پرچے مری میں پچھلے سال ملے تھے۔ پھر ستمبر ۷۰ئ میں میرا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ میں نے سیارہ ڈائجسٹ کے دفتر میں نئے پتے پر بھیجا لیکن شاید انہیں یہ خط نہیں ملا۔ چناں چہ پنڈی میں مجھے کوئی پرچہ نہیں ملا۔ اگر آپ جون اور جولائی کے شمارے (Cutting) بھیج سکیں تو میں پڑھ کر واپس کر دوں گا اور اپنی رائے بھی لکھوں گا۔ TV پر وہ پروگرام بالکل خراب تھا اور غالباً انھوں نے جلدی میں ترتیب دیا تھا۔ بہر حال اب کوئی مزید پروگرام نہیں ہو گا۔"(10)

شفیق الرحمن بسا اوقات اپنی مصروفیات کی بنا پر یا خط دیر سے پہنچنے کی وجہ سے اس کا جواب بروقت نہ دے سکتے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں وہ تمام خطوط کا جواب ارسال کرتے اور جواب بروقت نہ دینے کی وجہ بھی لکھتے تھے۔ شفیق الرحمن کی علمی و ادبی زندگی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''کرنیں'' زمانہ طالب علمی میں شائع ہوئی جب وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ انھوں نے مستنصر کو بھی سفر ناموں کی اشاعت کے بارے میں مفید مشورے دیئے۔ وہ باقاعدگی سے ان کے ابتدائی سفر نامے کی سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر قسط کا مطالعہ کرتے اور اس پر اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کرتے۔ جب مستنصر کا پہلا سفر نامہ اشاعت کے مراحل میں تھا تو انھوں نے نہ صرف اشاعت کے حوالے سے مفید مشوروں سے نوازا بل کہ کتاب کا نام تبدیل کرنے کا بھی کہا۔ ''نکلے تیری تلاش میں'' کا پہلا عنوان ''جائیو بدیس'' تھا۔ اسی بنا پر وہ ''برساتی'' کو اپنے سفر نامے کی ماں قرار دیتے ہیں۔ ''خطوط: شفیق الرحمن اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کا خط اور چوتھی قسط کی Cutting دونوں ملے، شکریہ چاروں Cutting ارسال ہیں، انہیں میں نے کئی مرتبہ پڑھا۔ سفر نامے پر آپ نے کافی محنت کی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ کتاب ضرور مقبول ہو گی۔ واقعات بہت دل چسپ ہیں اور انداز بیان میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آپ کے ہم راہ سیر کر رہا ہو۔ narrative کی روانی بھی قابل تعریف ہے۔ چند مشورے ارسال ہیں۔

۱۔ اگر ہو سکے تو کتاب کے ہر باب یعنی ہر Excursion کے ساتھ ایک نقشہ شامل کریں جس میں اپنا Route بذریعہ تیر دکھائیں۔

۲۔ جو فوٹو شامل کیے گئے ہیں وہ چھوٹے ہیں۔ کتاب میں ان سے کم از کم دگنے یا تگنے سائز کے فوٹو چھپوائیں۔

۳۔ جو انگریزی نام یا الفاظ مشکل سے ہوں انہیں انگریزی حرفوں میں بھی لکھا جائے۔

۴۔ کتاب کے پروف آپ خود Check کریں۔

۵۔ کتاب کا نام ضرور بدلیں۔ نام کے سلسلے میں ایک فارسی کا مصرع اور چند انگریزی کے اشعار ذہن میں آئے ہیں، شاید ان سے کچھ مدد مل سکے۔

ع زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد''(۱۱)

شفیق الرحمن علم دوست تھے وہ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی کاموں کے لیے وقت نکالتے تھے۔ وہ خط میں رسمی اور پر تکلف گفت گو نہیں کرتے تھے بل کہ براہ راست موضوع کا جواب لکھ دیتے۔ سفر نامہ سے ان کو خاص لگاؤ تھا اس وجہ سے وہ مستنصر کے سفر نامے کی اشاعت میں خاص دل چسپی رکھتے تھے۔ ''نکلے تیرے تلاش میں'' جب شائع ہوا تو اس موقع پر مبادک باد پیش کرتے ہوئے اپنے مجموعی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ''خطوط: شفیق الرحمن لکھتے ہیں:

''آپ کی کتاب عمدہ چھپی ہے۔ سرورق، گٹ اپ اور تصویریں دیدہ زیب ہیں۔ آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، خصوصاً اس بات پر کہ آپ کی پہلی کتاب اس آن بان سے آئی ہے۔ نقشہ اور تصویریں کتاب کی دل چسپی میں اضافہ کرتی ہیں۔ سفر نامے کے بیش تر حصوں کو فرداً فرداً پڑھ چکا ہوں۔ اب دوبارہ پڑھا، مجموعی طور پر سفر نامے میں ایک طویل کہانی کی دل چسپی ہے۔ یہ تحریر کی اثر آفرینی اور سادگی ہے کہ پڑھنے والا نظاروں اور واقعات کو محض کسی جھروکے سے نہیں دیکھتا بل کہ قریب سے ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جو کہانی Cine scope فلم کے سکرین پر شروع ہوئی تھی، یہ پردہ وسیع اور وسیع تر ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ پڑھنے والا سیاح کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، میرے خیال میں سفر نامے کی یہ نمایاں خوبی ہے۔ امید ہے کہ کتاب مقبول ہو گی اور آپ آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ اندلس کا سفر نامہ الگ چھپوا رہے ہیں۔ اندلس میں ایسی انفرادیت اور دل کشی ہے کہ اس کا سفر نامہ علیحدہ چھپنا چاہیے۔"(۱۲)

''اندلس میں اجنبی'' مستنصر کا دوسرا سفر نامہ تھا۔ جس کی علیحدہ اشاعت پر شفیق الرحمن نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ''اندلس'' اپنی تاریخی و ثقافتی پس منظر کی بنا پر اہمیت کا حامل اور مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مقدم رہا ہے۔ اندلس کی تاریخ کی جمع آوری کے لیے مستنصر نے مختلف کتب خانوں میں تاریخ کی ورق گردانی کی اس سے ان کا فنی ارتقا بھی دکھائی دیتا

ہے۔انھوں نے مقامات و شخصیات جو ان کے پیش رہے ہیں کو اپنی تحریر کے زیر اثر پر کشش اور لازوال بنا دیا ہے وہ خط میں لکھتے ہیں:

> ”اندلس میں اجنبی“مستنصر حسین تارڑ نے جس چاؤ اور جس محبت سے اندلس اور اندلیسوں کا ذکر کیا ہے،وہ ہاں قطعاً اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔میرے خیال میں اس کتاب کا نام ”اندلس میں ایک اندلسی“ ہونا چاہیے۔(۱۳)“

”خانہ بدوش“ ان کی اگلی منزل تھا جو کہ ۱۹۸۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔اس سفر نامے کی اشاعت کے موقع پر شفیق الرحمن نے اس کے عنوان کو سفر نامے کے حوالے سے موزوں قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”آپ کا خط ملا، شکریہ۔”خانہ بدوش“ نہایت موزوں نام ہے۔
>
> دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں جب کبھی ہم کسی کیمپ میں یا چھاؤنی میں بقول انگریزوں کے Stranded ہو جاتے یعنی تین چار مہینے گزر جاتے تو انگریز طرح طرح کے بہانوں سے سیر سپاٹے کی کوشش کرتے۔صحرا سے قاہرہ یا سکندریہ۔آسام، دار جلنگ وغیرہ اور جب کوئی اس بے چینی کی وجہ دریافت کرتا تو اکثر یہ جواب ملتا"Its is the gypsy in me"
>
> ایک انگریز کمانڈنگ افسر نےCharles Kingsley کے یہ اشعار فریم کرا کےMess میں آویزاں کرائے۔
>
> When all the world is young lad
> and every tree is green
>
> اتفاق سے آپ کا”داستان گو“ نمایاں نثر نگاروں کے بارے میں پاکستان ٹیلی ویژن کا خصوصی پروگرام نہیں دیکھ سکا۔دو کتابیں پسند آئی تھیں ، ملی ہوں گی۔ امید ہے کہ آپ کو بھی دل چسپ معلوم ہوں گی خصوصاً اسپین اور وہاں کے باشندوں کا تذکرہ۔۔۔ جس میں مصنف نےMoors کو بھی شامل کیا ہے۔(۱۴)"

ہر انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات آتے ہیں جب اسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے وہ رازداں کر سکے۔اس سے اپنی دل باتیں کہہ سکے جو وہ کسی اور سے نہیں کر سکتا۔زندگی میں اسی طور کچھ ایسے لمحے بھی آئے جب مستنصر نے شفیق الرحمن کو اپنا رازداں کیا۔ان سے نہ صرف دل کی بات کہی جو کسی اور سے نہ کر سکے بل کہ ان سے مشورے کی درخواست بھی کی۔ شفیق الرحمن نے بھی ایک سچے اور مہربان دوست کی طرح ہمیشہ ان کی دل جوئی کی۔اسی طرح جب زندگی کے ایک مشکل لمحے میں مستنصر کو ان سے مشورے کی ضرورت پڑی تو انھوں اپنے خط میں کچھ اسی طرح دل جوئی کی۔ شفیق الرحمن خط میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> ”آپ کا خط ملا، شکریہ۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔ ابھی واپس آیا ہوں۔ اس لیے خط لکھنے میں دیر ہوئی۔ تجربہ کار دوستوں کا کہنا ہے کہ جب حالات پریشان کن ہونے لگتے ہیں تو گرتے گرتے ایکLevel تک پہنچتے ہیں،وہاںSteady ہو کر پھر انہیں بہتر ہونا پڑتا ہے۔امید ہے کہ اب بہتری ہو گی۔اللہ تعالیٰ آپ کو مسرتیں عطا فرمائے۔(۱۵)"

شفیق الرحمن ہر اتوار کی صبح راولپنڈی کے راجہ بازار کا رخ کرتے جس کے فٹ پاتھوں پر پرانی کتابوں کی نمائش

میں سے اپنے دوستوں کی پسند کی کتابیں خرید کر انہیں تحفہ بھیجا کرتے۔ یہ ان کی کتب سے محبت کا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک کتاب سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں۔ مستنصر کے لیے تحفہ کی جانے والی کتابوں میں قدیم سفر ناموں، تاریخ کی کتابیں اور شاہ کار ناولوں کا انتخاب کرتے تھے۔ شفیق الرحمن اپنی تازہ شائع ہونے والی کتب بھی ان کے ذوق مطالعہ کی نذر کرتے اور کتب پر خود بھی پسندیدگی کا اظہار کرتے ساتھ اپنے معاصرین کی ان کتب پر رائے بھی خطوط میں لکھ بھیجتے۔ کتابوں کی اشاعت میں پیش مشکلات کو بھی ان خطوط میں بیان جس کا اندازہ ''خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر ان چند خطوط سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے:

> ''اتنے طویل وقفے کے بعد آپ کا خط ملا، بڑی خوشی ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی و دیگر احباب نے بھی کتاب کے ڈسٹ کور، کاغذ، کتابت اور مجموعی Production کے متعلق یہی رائے لکھی ہے۔ ایک تو پنڈی سے طباعت وغیرہ کی نگرانی مشکل تھی، دوسرے یہ کہ کچھ ایسے حالات بھی تھے جن کا ذکر طویل ہے۔۔۔۔ ایک Ordinary کاپی علیحدہ بھیج رہا ہوں۔ اس کے ساتھ انگریز عورتوں کے سفر نامے بھی ہیں امید ہے کہ یہ آپ کو پسند آئیں گے۔ (۱۶)"

شفیق الرحمن ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے اور انھیں ہمیشہ یہ معلوم رہتا کہ ان کے کس دوست کو کس کتاب کی ضرورت ہے وہ دوستوں کے ذوق مطالعہ کے عین مطابق کتب کا انتخاب کر کے ان کے لیے بہ طور تحفہ ارسال کر دیتے۔ مختلف مواقع پر تحفہ کی گئی کتب کے بارے میں اپنے خطوط میں لکھتے ہیں:

> ''جب کبھی کسی دل چسپ سفر نامے کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے تو آپ یاد آجاتے ہیں۔ چناں چہ Dumas کا سفر اور "Vagabonds in Serbia" ارسال ہیں اور ساتھ ہی ہیر لڈلیمب کی تین کتابیں۔ جو تاریخ سے متعلق ہیں لیکن ان میں سے کچھ کچھ Travelogue والی جاذبیت بھی ہے۔ برخودار سلجوق سے یہ پوچھیں کہ وہ ''حماقتیں'' کے علاوہ میری دیگر کتابیں پرواز، لہریں وغیرہ پڑھنا چاہے تو میں اسے ضرور بھیجوں گا۔ (۱۷)''

شفیق الرحمن اپنی کتاب ''دجلہ'' کی اشاعت پر موقع پر مستنصر حسین تارڑ کو اس کتاب کی بابت خط میں کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ''اس پر بہت خوشی ہوئی کہ نئی کتاب ''دجلہ'' آپ کو پسند آئی۔ ڈینیوب کے دو کردار اس لیے شامل کیے کہ پرانے Notes کا مطالعہ کر لیا۔ کہانی کو دوبارہ لکھنے سے پہلے۔ یہ دونوں میرے ساتھ گئے تھے۔ مجد ہی کا اصل نام نصر اللہ مژدہی تھا اور ہیمل کا نام وہی تھا جو لکھا ہے۔ پہلی مرتبہ ڈینیوب لکھتے وقت اختصار مد نظر تھا، کیوں کہ ''سویرا'' میں دو دریائے نیل اور ڈینیوب اکٹھے چھپنے تھے۔ ''دھند'' کا کیمپ کانگڑہ کی وادی میں تھا جہاں سے Kallus Valley شروع ہوئی ہے۔ دجلہ کو دوبارہ لکھنے سے پہلے بھی پرانے Notes پڑھے تھے۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ دجلہ ''بصرے سے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے'' ختم ہونا چاہیے۔ بس اسی وقت خیال ہی نہیں آیا اور وہ Life is short and Art is long والا فقرہ ذہن میں رہا۔ چوں کہ اس کتاب میں کاغذ اچھا نہیں ہے، اس لیے یہ طے ہوا کہ بہتر کاغذ، بہتر ڈسٹ کور ہو اور بقیہ جلدیں

Paperback میں چھاپی جائیں۔چند دنوں سے دفتر جانا شروع کیا ہے۔مبارک باد کے لیے از حد ممنون ہوں۔آپ کی نئی کتابوں کا انتظار رہے گا۔(۱۸)"

شفیق الرحمن، مستنصر کی نئی شائع ہونے والی کتب کی منتظر رہتے اور اپنے خطوط میں وقتاً فوقتاً ان کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ان کتب کی اشاعت پر وہ ستائش و تعریف کے خط لکھتے:

"خانہ بدوش" کا انتظار رہے گا۔(۱۹)"

"منی سیریل کا نام "پرواز" آپ ضرور رکھ لیں۔"(۲۰)

"ہنزہ داستان" بھی آپ کی دیگر کتاب کی طرح نہایت دل چسپ ہو گی۔"(۲۱)

"آج آپ کا پیکٹ ملا جس میں "چچپی" ہے اور آپ کا خط۔از حد ممنون ہوں۔"(۲۲)

شفیق الرحمن کو ملازمت کے دوران متعدد ممالک کے بہت سے محاذوں پہ فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔اس دوران انھوں نے ہندوستان سمیت مختلف ممالک کی سیر کی۔مستنصر جب بھی کسی علاقہ کی سیاحت کا ارادہ کرتے تو وہ اس کے حوالے سے شفیق الرحمن کو لکھ بھیجتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے۔وہ انھیں اس علاقے کے حالات آگاہ کرتے۔گلگت، ہنزہ کے سفر کی داستان پڑھنے کے بعد، وہ ان علاقوں کے موسم کی صورت حال بیان کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کے سفر کے متعلق پڑھ کر مجھے لاول تھامس جن کی کتاب چپ with Lawrence of Arabia چھپتے ہی فوراً Best Seller ہو گئی تھی کا گلگت، ہنزہ، سکردو، استور وغیرہ کا Trip یاد آ گیا۔ان دنوں میں آزاد کشمیر کے میڈیکل Setup میں میجر تھا۔وہ اپنی پارٹی سمیت یہاں شمالی علاقوں کے پس منظر میں فلم بنانے آئے تھے کہ موسم اچانک یوں تبدیل ہوا کہ ان کا سارا ساز و سامان بڑے کیمرے سمیت دریائے سندھ میں بہہ گیا اور انہیں واپس لوٹنا پڑا۔پہاڑی علاقوں اور خصوصاً ہمارے Northern Areas کے سفر میں موسم کے غیر یقینی پن کا سارے سیاحوں نے ذکر کیا ہے۔"(۲۳)

انھوں نے آخری خط جو مستنصر کے نام ۲۳ اپریل ۱۹۹۸ء کو لکھا جس میں انھوں نے اپنی طرف سے ارسال کردہ کتب کی تفصیل ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"آپ کا ارسال شدہ پیکٹ ملا۔اس دل چسپ و شوخ مجموعے کا انتساب آپ کے خلوص و محبت کا مظہر ہے اور میرے لیے باعث صد مسرت ہے۔از حد ممنون ہوں۔ان میں سے کچھ تحریریں جانی پہچانی ہیں۔چند کا ذکر دوستوں نے کیا تھا۔میں گاؤں جا رہا ہوں، وہاں پوری کتاب کو اطمینان سے پڑھوں گا۔"(۲۴)

شفیق الرحمن کے ان خطوط سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ادیبوں کے درمیان محبت، عقیدت اور احترام کا رشتہ تھا۔وہ ہر موقع پر ایک دوسرے سے مشورہ کیے بغیر کوئی ادبی و ذاتی کام نہیں کرتے تھے۔کتاب کی اشاعت ہو، سیاحت ہو، بچوں کے تعلیمی میدان کا چناؤ ہو یا ذاتی زندگی کے حوالے سے کوئی اہم فیصلہ وہ ایک دوسرے سے مشاورت سے طے کیا کرتے تھے۔شفیق الرحمن نے اپنی فوجی ملازمت کی وجہ سے دنیا بھر کی سیر کی۔مستنصر جب بھی کسی علاقے کی سیاحت کا ارادہ باندھتے تو ان کو خط میں لکھ بھیجتے اور وہ انھیں اس علاقے کے موسم، حالات اور ثقافت سے آگاہ کر دیتے جس سے سفر میں ان کے لیے آسانی رہتی۔انھوں نے مستنصر کے ادبی سفر میں رہ نما کے طور پر مفید مشوروں سے نوازا جس پر وہ آج بھی ان کے ممنون ہیں۔مستنصر کے معاصر ادیبوں سے چشمک کی بنا پر دونوں میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی

لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ان کی دوستی جس کا آغاز بہ طور فین ہوا تھا شفیق الرحمن کی زندگی تک جاری رہا۔ان کے یہ خطوط ادب کا اہم سرمایہ ہیں جس سے ان کے زندگی کے اہم گوشے منور ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی جوانی اور ادبی زندگی کی ابتدا انھی نابغہ روزگار ادبی شفیق الرحمن جیسے نابغہ روزگار ادیب کے زیر سایہ ہوئی۔کوئی بھی نئی تخلیق کے بارے میں اس سے مشاورت کرتے تھے۔انہیں اپنی کتابوں کے مسودات ارسال کرتے تاکہ اشاعت سے پہلے وہ ان کی نظر سے گزر جائے تاکہ اس راہ پا جانے والی کمی کوتاہی کو دور کر سکیں۔گویا کہ ان خطوط کی ادبی سطح پر بہت زیادہ قدر و منزلت ہے۔مستنصر نے ان خطوط کو شائع کر کے ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔ادب میں تحقیق و تدوین کے متلاشی محققین کے لیے یہ خطوط اہمیت کے حامل ہیں جو کہ شفیق الرحمن کی زندگی، ادبی کارناموں اور نمایاں جہات کی تحقیق میں اہم سنگ میل کی اہمیت رکھتے ہیں کوئی بھی تحقیق ان کے بغیر ادھوری رہے گی۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سکندر حیات میکن، ادبی مکتوب نگاری کی تحقیق: ایک مایوس کن صورت حال، مشمولہ مضمون، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۵۰۔

(۲) اشفاق احمد ورک، شفیق الرحمن: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء، ۹۔

(۳) طیبہ خاتون، اردو نثر کی داستان، آزاد کشمیر: ارسلان بکس میرپور، ۲۰۰۳، ۵۔

(۴) مستنصر حسین تارڑ، انٹرویو، بمقام تکیہ تارڑ، لاہور، ماڈل ٹاؤن، ۲۷ فروری 2021ء

(۵) مستنصر حسین تارڑ، انٹرویو، بمقام تکیہ تارڑ، لاہور، ماڈل ٹاؤن، ۰۳ ارچ 2021ء

(۶) مستنصر حسین تارڑ، خطوط: شفیق الرحمن، کرنل محمد خان، محمد خالد اختر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2012ء، ۲۵۔

(۷) ایضاً، ۴۳۔

(۸) ایضاً، ۹۔۱۰

(۹) ایضاً، ۴۰۔

(۱۰) ایضاً، ۴۱۔

(۱۱) ایضاً، ۴۲۔۴۳۔

(۱۲) ایضاً، ۴۵۔

(۱۳) ایضاً، ۴۸۔

(۱۴) ایضاً، ۵۰۔۵۱۔

(۱۵) ایضاً، ۵۲۔

(۱۶) ایضاً، ۵۳۔

(۱۷) ایضاً، ۵۵۔

(۱۸) ایضاً، ۵۴۔

(۱۹) ایضاً، ۵۴۔

(۲۰) ایضاً، ۶۱۔

(۲۱) ایضاً، ۶۳۔

(۲۲) ایضاً، ۶۶۔

(۲۳) ایضاً، ۶۹۔

(۲۴) ایضاً، ۷۱۔

❖❖❖